حامدی صاحب کے تحریکی سفر کی داستان

(بہ شکل خطوط بنام قاری منہاج الدین صاحب)

مولانا خلیل حامدی ڈائرکٹر ادارہ معارف اسلامی۔ منصورہ۔ لاہور

ماریشس اور اسمرا کے بارے میں رُوداد احوال لکھ کر بھیج چکا ہوں۔ میں ۱۷ دسمبر ۱۹۸۳ء کو ماریشس سے دارالاسلام آگیا تھا۔ پورٹ لوئس سے دارالسلام تک ہوائی جہاز کی فلائٹ تقریباً ۴ گھنٹے کی تھی۔ ایئرپورٹ پر مجھے چھوڑنے کے لیے محمد حسین دھال آئے۔ لفت ہانزا کے کاؤنٹر پر جب ہم سامان دینے لگے تو سامان لینے والی لڑکی دھال صاحب سے کہنے لگی کہ میں مسلمان ہوں اور میں نے ایک غیر مسلم (جو شاید ہندو ہے) سے شادی کر لی ہے، مگر شادی سے پہلے میں نے اُس پر یہ شرط عاید کی ہے کہ وہ اسلام قبول کر لے، چنانچہ وہ مسلمان ہو چکا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ اُسے اسلامک سرکل کے دفتر میں لاؤں تاکہ آپ یا ملک محمد حسین صاحب اُسے اسلام کے بارے میں مضبوط و مستحکم کر دیں۔ میں نے محمد حسین دھال صاحب سے پوچھا کہ کیا ماریشس میں مسلمان لڑکیاں غیر مسلموں سے شادی کر لیتی ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ایسے نام نہاد مسلمان گھرانے جو اسلام سے ناآشنا اور مغربی تہذیب کے رسیا ہو چکے ہیں، مذاہب کی حدود و قیود سے بالا ہیں ان گھرانوں کی لڑکیاں اور لڑکے جہاں چاہیں شادی کر لیں۔ تاہم ہم لوگ مسلمانوں کے اندر برابر اس بات کو پھیلا رہے ہیں کہ کوئی مسلمان لڑکی کسی غیر مسلم سے شادی نہیں کر سکتی۔

ایئرپورٹ پر امیگریشن افسر بھی دھال صاحب کا پیرو کار نکلا۔ اُس نے دُور سے ہمیں

دیکھ لیا اور پاسپورٹ لے کر خود ہی خروج لگا دیا۔ ہمارا جہاز دارالسلام جا رہا ہے۔ اس میں زیادہ تر مسافر فرینکفرٹ جانے والے ہیں۔ یہ جرمن اور فرانسیسی ہیں، مگر ——— اعوذ باللہ ——— کیا عرض کیا جائے کہ یہ لوگ حیوانیت کے کس درجے تک پہنچ چکے ہیں۔ ان کے نزدیک شرم و حیا نام کی قدر کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ غیرت و حیا سے محروم، لباس ساتر سے عاری، ذوقِ انسانی سے بے گانہ اور جنسی خواہش کی تسکین کے لیے ہر حالت اور ہر وقت بے تاب۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اُس نے ہمیں اپنے دین کا فہم عطا کیا، اپنے راستے کی ہدایت دی اور اپنے رسولؐ کے ذریعے ہمیں زندگی کا صحیح قرینہ بتایا۔

رات کے آٹھ بجے ہم دارالسلام کے ہوائی اڈے پہ پہنچ گئے۔ یہ ایئرپورٹ کیا ہے بھیک منگوں کا اڈہ ہے۔ ویزا لگانے والا افسر، ہیلتھ سرٹیفکیٹ چیک کرنے والا افسر، کسٹم آفیسرز تمام کے تمام بات بات پہ خیرات مانگتے ہیں۔ خاکسار نے آج تک جتنے ملک دیکھے ہیں، کسی جگہ ہوائی اڈے پر ایسی گداگری نہیں دیکھی۔ یہ ہے دراصل اُس اشتراکیت کا پھل جسے بابو عبدالرحمٰن اور عبید کروسے نے ۱۹۶۴ء میں یہاں جاری کیا ہے۔ بڑی مشکل اور ردّ و کد کے بعد ایئرپورٹ والوں سے نجات حاصل کی۔ اب کافی دیر ہو چکی تھی، اس لیے ٹیکسی لے کر دارالسلام شہر روانہ ہو گیا اور رکمبو دیا نامی ہوٹل میں اُتر گیا۔ صبح اُٹھا تو معلوم ہوا کہ آج اتوار ہے اور اس پہ مزید کرسمس کی تیاریوں کے دن ہیں، اس لیے لوگ اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے ہیں۔ خاکسار بعض دوستوں کو ہوٹل سے فون کرتا رہا، مگر چھٹی کی وجہ سے لوگ گھروں میں نہیں ملے۔

ہوٹل سے نکل کر بازار میں گردش کی۔ دکانیں بند ہیں۔ صرف ریستوران اور بار کھلی ہوئی ہیں۔ سڑکوں پہ پرائیویٹ کار نہیں چل رہی ہے، بلکہ صرف ٹیکسی نظر آ رہی ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ تنزانیہ میں چھٹی کے دن پرائیویٹ کار چلانا ممنوع ہے تاکہ پٹرول کی بچت ہو سکے۔ بازاروں میں بے کار اور مفلوک الحال مردوں اور عورتوں اور بچوں کے جھنڈ کے جھنڈ اِدھر اُدھر پھر رہے ہیں۔ موسم گرم ہے اس لیے بے روزگار لوگ فٹ پاتھوں پر ہی شب باشی کر لیتے ہیں۔

تنزانیہ دو ملکوں کے اتحاد کا نام ہے۔ ٹانگانیکا اور زنجبار۔ ثانی الذکر ملک یعنی زنجبار در اصل قدیم عرب مملکت ہے۔ یہ مملکت ۱۸۵۶ء تک سلطانِ مسقط کے تابع تھی، مگر جب مسقط کے سلطان سید سعید کا انتقال ہوا تو زنجبار الگ مملکت کے طور پر وجود میں آگیا۔ اور مقامی شیوخ نے اس پر اپنی حکومت قائم کرلی ۱۸۸۰ء میں یہ برطانوی حمایت کے زیر اثر آگیا اور ۱۰ دسمبر ۱۹۶۳ء کو اسے آزادی مل گئی، مگر آزادی کے بعد اس پر یہ افتاد پڑی کہ زنجباری کمیونسٹوں نے انقلاب برپا کر دیا اور پھر خود عرب کمیونسٹوں نے عرب عوام کا قتل عام کیا۔ ٹانگانیکا کی تاریخ بھی زنجبار سے مختلف نہیں ہے، البتہ ٹانگانیکا میں اکثریت غیر مسلموں کی ہے۔ ٹانگانیکا ۱۹۱۸ء میں برطانوی انقلاب کے تحت آیا۔ ۱۹۴۶ء میں اسے اقوام متحدہ کی سرپرستی میں دے دیا گیا۔ دسمبر ۱۹۶۱ء میں اسے آزادی ملی اور عروشہ ڈیکلریشن کے تحت زنجبار اور ٹانگانیکا ۲۶ر اپریل ۱۹۶۴ء کو یونائیٹڈ ریپبلک آف تنزانیہ میں تبدیل ہوگئے اور اس روز سے یہ ملک ایک اشتراکی ریاست میں تبدیل ہوگیا۔ محسوس ہوتا ہے کہ لوگ اب اشتراکیت سے سیر ہو چکے ہیں۔ مقامی سکے کا یہ حال ہے کہ بنک میں سرکاری بھاؤ سے ایک امریکی ڈالر کے عوض ۱۴ تنزانی روپے ملتے ہیں اور بازار میں ایک ڈالر کے عوض ۵۰ تنزانی روپے ملتے ہیں۔ اشیائے ضرورت کی قلت اس قدر ہے کہ دکانیں خالی پڑی ہیں۔

دارالسلام سمندر کے کنارے واقع ہے۔ جہاں تک قدرتی حسن و جمال کا تعلق ہے تنزانیہ بڑا شاداب اور دلکش ملک ہے۔ ساحل سمندر بڑا خوبصورت ہے۔ ساحل کے ساتھ ساتھ درختوں کے جھنڈ ہیں۔ آم، ناریل، پپیتا اور شریفہ کے باغات بکثرت ہیں۔ گھروں میں بھی لوگوں نے پھل دار درخت لگا رکھے ہیں۔ بڑی زرخیز زمین ہے۔ اگر کسی ٹہنی کو زینت کی خاطر نصب کر دیا جائے تو وہ بھی چند روز کے اندر جڑیں نکال لیتی ہے۔ بیگان ویلی نے شاہراہوں پر کیف آور فضا پیدا کر رکھی ہے۔ یہ سب حسن و جمال دامنِ دل کو پکڑے بغیر نہیں رہ سکتا، مگر انسانوں کی طرف دیکھیں تو سیاہ اور بوسیدہ چہرے جیسے بے آباد کھنڈر ہوں۔ پھٹے ہوئے بے ڈھنگے لباس جیسے کسی اشتراکی شاعر نے

آزاد نظم لکھی ہو۔ کم سن بچے اور نوخیز دوشیزائیں غربت اور بے کسی کے ہاتھوں چکنا چور۔ ایک طرف یہ حال اور دوسری طرف سفید فام یورپین مشنری عظیم الشان کاروں میں اِدھر سے اُدھر بھاگے بھاگے پھر رہے ہیں۔ ان کے بنگلے شاندار اور اُن کی بود و باش نہایت اعلیٰ و ارفع۔ ایک ایک انگریز کی کوٹھی پر دس دس افریقی لڑکے اور لڑکیاں خدمت کے لیے موجود۔

اتوار کا دن تھا۔ خاکسار نے دارالسلام کے بعض حصوں کا مشاہدہ کیا۔ اہم مقامات پر فوج کے سپاہی تعینات ہیں، لیکن ان کی حالت بھی بڑی دگرگوں۔ بوسیدہ وردیاں کہنہ اور از کار رفتہ ہتھیار اور مفلوک الحالی کی وجہ سے نہ اُن کی رفتار میں چال کی اور نہ اعضا میں پھرتی اور توانائی۔ کسی ریستوران کے پاس سے گزریں تو ریستوران کے اندر بیٹھ کر کھانے والے کم اور باہر کھانے والوں کو تاک تاک کر دیکھنے والے زیادہ۔ کتابوں کی ایک دکان کے پاس سے خاکسار کا گزر ہوا تو شوروم میں جو کتابیں رکھی ہوئی نظر آئیں ان میں لینن اور مارکس اور ان کے خیمہ برداروں کی تصنیفات یا پھر عیسائیت کا تبلیغی لٹریچر۔ بعض کتابیں افریقی قبائل کی تاریخ و ثقافت سے متعلق بھی تھیں۔ کمبوڈیا ہوٹل کا مالک ایک مسلمان ہے۔ اس وجہ سے یہ ہوٹل بُرائیوں سے پاک ہے، البتہ یہاں کھانے کا انتظام معقول نہیں ہے۔ خاکسار چند قدم کے فاصلے پہ ایک ریستوران میں کھانے کے لیے گیا۔ اس کا مالک مسقطی عرب ہے۔ عربی زبان بولتا ہے۔ مجھ سے جب اُس کا تعارف ہوا تو کہنے لگا کہ آج کل یہاں کاروبار بالکل ٹھپ ہو چکا ہے۔ مُلک میں اشیا کی قلّت اور بے روزگاری عام ہے۔ ہم لوگ اب اپنا کاروبار ٹھپ کر کے مسقط جانا چاہتے ہیں۔ اُس نے اپنی بشرٹ کی طرف اشارہ کیا کہ یہ جدّہ میں دس ریال میں ملتی ہے اور یہاں دارالسلام میں اوّلاً تو ملتی نہیں ہے اور اگر ملے گی تو چار سو تنزانی روپے سے کم نہ ملے گی۔ اس کے ریستوران میں صرف چاول اور گوشت تھا۔ وہ خود ہی کہنے لگا کہ یہاں یہ بھی غنیمت ہے کہ چاول کا راشن مل جاتا ہے اور ہم لوگ ریستوران چلا رہے ہیں، ورنہ بعض اوقات تو اشیائے خوردنی کا اس قدر بحران پیدا ہو جاتا ہے کہ لوگ تنگ آ جاتے ہیں۔

دار السلام پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ معاشی حالت تو تباہ ہو چکی ہے اخلاقی حالت بھی انتہائی خراب ہے۔ چوری، لوٹ مار اور عصمت فروشی کا رواج عام معلوم ہوتا ہے۔ دار السلام کی آبادی ۱۹۸۰ء کی مردم شماری کے موجب ۷ لاکھ، ۵ ہزار ہے۔ آبادی کی غالب اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ عیسائی اور ارواح پرست بھی ہیں جرائم کا ارتکاب زیادہ تر غیر مسلم آبادی کرتی ہے۔ مسلمان اپنی مظلومیت اور پسماندگی کے باوجود نسبتاً بہتر اخلاق اور کردار کے مالک ہیں۔ دار السلام پرانا شہر ہے۔ تاریخ میں یہ صحیح معنوں میں امن و سلامتی کا گھر تھا اور اسی نسبت سے دار السلام کہا گیا، مگر اب حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ سات سال کے اندر ڈوڈوما (DODOMA) شہر کو ملک کا دار الحکومت بنا دیا جائے گا۔ خاکسار کو یہ بات سن کر بہت حیرت ہوئی کہ ملک معاشی پسماندگی کا شکار ہے اور حکومت ایک نیا دار الحکومت تعمیر کرانے کی سوچ رہی ہے۔

۱۹ر دسمبر ۱۹۸۳ء کو خاکسار نے علی الصبح ہارون سجن کی دکان پر فون کیا۔ یہ دکان ہمارے رفیق محمد احمد کی دکان ہے اور یہ نوجوان سونے کا کاروبار کرتے ہیں، اس لیے "محمد سونے والا" کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ دکان کمبوڈیا ہوٹل سے دور نہیں ہے۔ خاکسار چہل قدمی کرتے وہاں پہنچ گیا۔ معلوم ہوا کہ ابھی تک محمد احمد صاحب دکان پر نہیں پہنچے۔ ان کے پڑوسی کی دکان کھل چکی تھی۔ اس نے مجھے اشارہ کیا اور میں اس کی دکان میں بیٹھ گیا۔ ان صاحب کا نام شمعون ہے۔ داؤدی بوہرہ فرقے سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ یہاں ملازم ہے اور دکان کا اصل مالک ایک ہندو سیٹھ ہے۔ ملاقات ہوتے ہی شمعون نے مجھے پاکستانی دیکھ کر دل کے پھپھولے پھوڑنے شروع کر دیے۔ اس نے بتایا کہ چند ماہ پیشتر حکومت نے تمام بڑے بڑے دکانداروں کو یک دم جیل میں ڈال دیا۔ ان پر الزام یہ لگایا گیا کہ یہ لوگ اشیائے ضرورت کا ذخیرہ کر رہے ہیں اور اُسے عوام الناس کے ہاتھ فروخت نہیں کرتے، مگر شمعون کا کہنا تھا کہ لوگوں کے پاس قوتِ خرید نہیں ہے۔ تنزانی روپیہ بالکل گر چکا ہے جب کہ لوگوں کی آمدنی محدود اور لوگوں کی تنخواہیں بہت کم ہیں۔ معاشی زندگی پر سب سے بڑا اثر حکومت کی زرعی اصلاحات نے ڈالا ہے۔ حکومت نے افراد کے ہاتھ سے زمین لے لی اور اجتماعی کھیتی باڑی کا انتظام

جاری کر دیا۔ اس کے نتیجے میں لوگوں کی زراعت سے دلچسپی بہت کم ہوگئی اور یک دم معاشی بحران پیدا ہوگیا۔ دیہاتوں سے لوگ اُٹھ اُٹھ کر شہروں کا رُخ کرنے لگے تاکہ روزگار حاصل کر سکیں۔ نتیجتاً ایک طرف اشیاء کی قیمت اور مکانوں کے کرائے چڑھ گئے اور دوسری طرف بیروزگاروں کے گروہ کے گروہ شہروں میں بے کار رہنے لگے۔ پھر کیا تھا، چوری اور ڈکیتی حد درجہ بڑھ گئی۔ دیہاتی لڑکیاں عصمت فروشی پر اُتر آئیں، اور پورا معاشرہ اُلٹ پلٹ ہوگیا۔ اب حکومت نے تاجروں کو جیل میں ڈال دیا ہے۔ اس طرح سے رہی سہی تجارتی حرکت بھی جامد ہو گئی ہے۔ اب حال ہی میں حکومت نے نیا قانون جاری کیا ہے۔ اس قانون کی رُو سے حکومت تجارت کرنے کا صرف اسی آدمی کو لائسنس دے گی جو کم از کم دو ایکڑ زمین کاشت کرے گا یا کروائے گا۔ آخر میں شمعون کہنے لگا: میر اسیٹھ بھی اب اس ملک کو خیر باد کہنے کی سوچ رہا ہے۔ الغرض میاں شمعون تو بہت کچھ بیان کرنا چاہتے تھے، مگر اس دوران "محمد سونے والا" آئے اور مجھے جس انسان کی تلاش تھی وہ مل گیا۔

محمد سونے والا کچھی ہیں۔ بڑے تپاک سے ملے۔ تحریک اسلامی کا بڑا جذبہ رکھتے ہیں گجراتی زبان میں انہوں نے جماعت کی چند کتابیں پڑھی ہیں۔ مجھے بتانے لگے کہ کل چھٹی کی وجہ سے میں بعض اصحاب سے ملنے گیا ہوا تھا، اس لیے افسوس ہے کہ کل آپ سے رابطہ نہ ہو سکا۔ محمد احمد میاں جیولر ہیں۔ اب میں اُن کی دکان میں بیٹھا ہوا ہوں۔ اِکا دُکا گاہک آنا شروع ہو گئے ہیں۔ دکان کا دروازہ گو کشادہ ہے مگر لوہے کی جالی کا گیٹ لگا ہوا ہے، اُسے ہر وقت تالا لگا رہتا ہے۔ جب کوئی گاہک داخل ہوتا ہے تو گیٹ مین تالا کھول دیتا ہے اور اُسے اندر کر دیتا ہے۔ اندر آ کر بھی وہ ایک اور چھوٹے سے کٹہرہ نما کمرے میں داخل ہو جاتا ہے اس کمرے کا دروازہ الیکٹرک کا ہے۔ محمد احمد صاحب اپنی نشست پر بیٹھے ہوئے ایک بٹن دباتے ہیں اور وہ دروازہ کھلتا ہے۔ اگر وہ بٹن نہ دبائیں تو گاہک اُسی کمرے میں محبوس رہتا ہے۔ یہ تمام انتظامات اور استحکامات قائم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ مقامی افریقی باشندے یکایک دکانوں میں گھس جاتے ہیں اور مال لوٹ کر لے جاتے ہیں، بلکہ مزید برآں یہ کہ دکاندار کو بھی بعض اوقات قتل کر دیتے ہیں۔ جتنی بڑی بڑی دکانیں دارالسلام میں ہیں

ان کا یہی نظام دخول و خروج ہے۔ یہ اس امر کا کھلا ثبوت ہے کہ تنزانیہ امن و سکون اور امانت و دیانت اور ترقی و خوشحالی سے محروم ہو چکا ہے۔ محمد احمد صاحب نے مزید بتایا کہ ہم صرف اُس آدمی کو سودا دیتے ہیں جو کسی اور قابلِ اعتماد آدمی کی طرف سے تعارفی خط لے کر آئے۔ اگر کسی کے پاس یہ خط یا شناخت نہ ہو تو ہم اُس سے بات ہی نہیں کرتے۔ مَیں جتنی دیر دکان میں بیٹھا رہا، یہ تماشا دیکھتا رہا۔ دو تین عورتیں سونے کا زیور خریدنے یا بیچنے کے لیے آئیں۔ اُن کے ہاتھوں میں تعارفی خطوط تھے۔

محمد نے ملک محمد حسین صاحب اور دیگر اصحاب کی خیریت دریافت کی۔ جماعت کے لوگوں کے حالات پوچھے۔ اسی دوران انھوں نے ایک اور فعال تحریکی کارکن ہاشم گرانا صاحب کو بھی فون کر دیا۔ شیخ احمد زرگر بھی آگئے۔ اُن کی بھی جیولری کی دکان ہے جو اسی بازار میں ہے۔ یہ جامع مسجد مارکیٹ کہلاتی ہے۔ مسجد ساتھ ہی ہے۔ شیخ احمد سنی مسجد کمیٹی کے صدر رہ چکے ہیں۔ دینی معاملات میں بہت دلچسپی لیتے رہتے ہیں۔ ایشیائی مسلمانوں کے اندر اچھا اثر و نفوذ رکھتے ہیں۔ اب ہم تمام لوگ محمد احمد کی دکان سے اُٹھ کر اپنے پرانے اور گہرے سوڈانی دوست عباس مصطفیٰ مقبول کے ہاں چل دیے۔ موصوف مدینہ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل ہیں۔ اور آٹھ سال سے سعودی عرب کے دارالافتا کی طرف سے دارالسلام میں دعوتِ اسلامی کی اشاعت کا فرض سرانجام دے رہے ہیں۔ تحریک اسلامی پاکستان اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ بڑا قلبی تعلق رکھتے ہیں۔ تعلیم کے زمانے میں مولانا مرحوم سے مدینہ منورہ میں مل چکے ہیں۔ ۱۹۸۲ء میں پاکستان بھی تشریف لائے تھے اور ایک ہفتہ منصورہ میں رہے تھے۔

عباس صاحب دفتر میں مل گئے۔ مجھے دیکھ کر حیرت و مسرت سے ملے جلے جذبات میں ڈوب گئے اور جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ میں نے کل سارا دن دارالسلام میں گزارا ہے تو بہت ناراض ہوئے۔ میں نے انھیں عرض کیا کہ جن اصحاب کے فون نمبر میرے پاس تھے وہ فون پر ملے نہیں۔ اور آپ کا فون نمبر میرے پاس نہیں تھا۔ بہر حال دیگر احباب تو رخصت ہو گئے تاکہ احبابِ تحریک سے رابطہ قائم کریں اور اجتماعی ملاقات کا انتظام کریں۔ عباس مجھے دفتر میں لے کر

بیٹھ گئے - ان کے ساتھ اور بھی تین چار سوڈانی مبعوث ہیں — یہ سب حضرات دارالسلام میں مختلف طریقوں سے دعوتِ اسلامی اور تعلیم دینی کی خدمات سرانجام دے رہے ہیں - ہم دفتر میں بیٹھے ہی تھے کہ دو تنزانیہ کی لڑکیاں آئیں اور انہوں نے اسلامی لٹریچر مانگا جس سے وہ اسلام کی اصل حقیقت کو سمجھ سکیں - عباس صاحب نے بتایا کہ مقامی نوجوانوں کے اندر اسلام کی بڑی جستجو پیدا ہو رہی ہے اور اسلامی لٹریچر کی اس قدر مانگ ہے کہ ہم اُسے پورا نہیں کر پاتے -

عباس صاحب اپنے دفتر سے اُٹھے اور میرے ساتھ کمبودیا ہوٹل چل دیئے - عباس صاحب نے ہوٹل سے میرا سامان لیا اور اپنے گھر لے آئے - ان کا مکان دارالسلام کے ترقی یافتہ علاقے میں واقع ہے - اسی علاقے میں غیر ملکی سفارت خانے اور مشن رہتے ہیں - مکان خوبصورت ہے - دونوں طرف پھل دار درخت ہیں - عباس صاحب سے معلوم ہوا کہ دارالسلام میں کرائے کا مکان دستیاب ہو جانا جوئے شیر لانا ہے - اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ اشتراکی حکومت نے برسرِ اقتدار آتے ہی جتنی عمارات تھیں "قومی تحویل" میں لے لیں - ان عمارات کی نشانی یہ ہے کہ ان کی پیشانی پر سواحلی زبان میں "مساجل ومجامبو" کے الفاظ درج ہوں گے ان الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ یہ عمارات سرکار کے ہاں رجسٹرڈ ہو چکی ہیں اور اب سرکار کی ملکیت ہیں - دارالسلام، زنجبار، ڈوڈوما، مورو گورو اور دیگر مقامات پر جو عمارت بھی قابلِ لحاظ ملے گی خواہ وہ رہائشی ہو یا تجارتی حکومت کے قبضے میں ہے - اس اندھا دھند اشتراکی اقدامات کا نتیجہ یہ نکلا کہ اب افراد عمارات نہیں بناتے اور جو عمارات کسی طرح سے بچ گئی ہیں اور ابھی افراد کے قبضے میں ہیں انہیں وہ مرمت نہیں کراتے - حکومت بھی اپنے قلیل وسائل اور حکمران پارٹی کی لوٹ کھسوٹ کی وجہ سے نئی رہائشی عمارات تعمیر نہیں کر سکی — آبادی میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اور مکانات کی تعداد وہی ہے جو آج سے بیس سال پہلے تھی - اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہاں مکان حاصل کرنا کس قدر مشکل بلکہ محال ہے -

(باقی بر صفحہ ۵۶)